ڈاکٹر سید محمد یوسف

توحید
اور
اس کے چند عملی پہلو

اللہ کا بڑا فضل اور احسان ہے کہ اس نے ہمارے ہی جیسے ایک بشر کو خاتم المرسلین یعنی آخری نبی بنا کر بھیجا اور اسلام کی راہ دکھائی۔

ہم جن کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ ایک مسلم گھرانے اور معاشرے میں پیدا ہوتے اور چھوٹے سے بڑے ہوئے ہمارا یہ فرض ہے کہ اسلام کی قدر پہچانیں۔ اسلام کوئی نسلی روایت نہیں ہے، خدا کا یہ آخری پیغام کسی ایک ملک کے لیے نہیں ہے۔ حقیقی معنی میں "مسلم" وہی ہے جو خدا کی طرف سے ودیعت کی ہوئی سمع (کان) بصر (آنکھ) اور فواد (دل) یعنی خبر، مشاہدہ، اور وجدان کی قوتوں سے کام لے کر اپنے ارادہ سے ایمان لائے۔ ایمان لائے اس پر کہ کائنات میں ایک ایسی ہستی کارفرما ہے جو خالق ہے، جس نے بلا کسی نمونے کے اس دنیا کو اور دنیا کی ہر چیز کو اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے، وہی اس کا مدبر ہے جو لحہ بہ لحہ اس کو قائم رکھے ہوئے چلا رہا ہے۔ وہی سارے جہانوں کا رب ہے جو کون و فساد کے لامتناہی سلسلے کو ابتدائے آفرینش سے برابر ارتقاء کے حکیمانہ مقصد اور غایت کی طرف لیے جا رہا ہے۔ اسی ارتقاء کی ایک اہم منزل زندگی کی نمود ہے۔ پھر زندگی کے ارتقاء کا کمال انسانی دماغ اور نطق یعنی غور و فکر کی صلاحیتوں کا وجود ہے۔ عقل خدا کی وہ امانت ہے جو انسان کا طرۂ امتیاز ہے۔ جہاں حیاتیاتی ارتقاء کی یہ آخری منزل ختم ہوتی ہے وہیں سے اخلاقی ارتقاء کی پہلی منزل شروع ہوتی ہے۔

حیاتیاتی نظام کی ذمہ داری تو خدا نے اپنے لیے مخصوص رکھی ہے۔ اسی لیے آسمانوں، زمین،

چاند، سورج، ستاروں اور ذرّوں میں کہیں فتور، خرابی، کج روی اور سُستی کے نظر آنے کا کوئی امکان نہیں۔ ما تری فی خلق الرحمٰن من تفاوت تم اللہ کی تخلیق میں کوئی فرق نہ پاؤگے فارجع البصر ایک بار اور نظر ڈالو ھل تریٰ من فطور کیا تمہیں کوئی عیب نظر آتا ہے؟ البتہ عالمِ بشری میں اخلاقی نظام، عدل، مساوات، اور باہمی ربط و توازن قائم رکھنے کے کام میں خدا نے خود انسان کو اپنا شریک کار بنایا ہے۔ یہی سب سے بڑا شرف، سب سے بڑی عزت اور سب سے بڑا امتحان اور سب سے بڑی آزمائش بھی ہے۔ اخلاقی نظام کے قیام اور محافظت کے لیے اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جہاد، اور جہاد کے لیے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی اخلاقی مقصد کی تکمیل کے لیے خدا نے انسان کو تسخیر کائنات کی صلاحیتیں بخشی ہیں۔ لیکن انسان ظلوم اور جہول واقع ہوا ہے۔ کبھی تو وہ فطرت کی ہولناک طاقتوں سے سہم جاتا ہے اور ان کے آگے سرنگوں ہو جاتا ہے۔ جھوٹے خداؤں کی پرستش کرنے لگتا ہے جو درحقیقت نفع نقصان کی کوئی طاقت نہیں رکھتے، یا پھر وہ کائنات سے گریز اور فرار کی راہ اختیار کرتا ہے، نہ تو خدا کی نعمتوں کو پہچانتا ہے، نہ اپنے آپ کو پہچانتا ہے اور خدا کو پہچانتا بھی ہے تو خدا کی مرضی پہچاننے سے عاجز رہتا ہے کبھی ایسا دور بھی آتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے تقاضا سے آگے بڑھتا ہے اور مادہ پر قابو پالیتا ہے۔ ذرہ کو جیر کرکے بے پناہ طاقت کا مالک ہو جاتا ہے، اس وقت اس کو اپنے اوپر غرور اور گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی تخلیق کے مقاصد کو بھول کر بہیمیت کے گڑھے میں جا پڑتا ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ہم نے انسان کو بہترین نمونے پر پیدا کیا ہے۔ ثم رددناہ اسفل سافلین ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ ہم اس کو پست سے پست سطح پر نیچے گرا دیتے ہیں۔ الا الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت باستثنا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے۔ باطل کے مقابلہ میں حق کی حمایت کے لیے خدا اپنے بندوں کی ایک میانہ رو جماعت کو مامور کرتا ہے جو کائنات کی تسخیر کرتی ہے اور خالق کائنات کے آگے سر جھکاتی ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتی ہے اور عالمگیر انسانی معاشرہ میں خدا کا بتلایا

ہو انظام اخلاق رائج کرتی ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے انسان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس کی نظر ساری کائنات کو محیط ہو، وہ ساری کائنات کو غیر منقسم اکائی سمجھے، تمام انسانوں کو بلاتفریق رنگ و نسل ایک برادری جانے اور اپنے آپ کو اس وسیع برادری کا ایک مساوی فرد اور ادنیٰ خادم گردانے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دور کا انسان اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ نظر کی یہ وسعت اور ہمہ گیری فضا میں سفر کرنے سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ اس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ انسان خالق کائنات سے رشتۂ عبودیت پیدا کرے۔ یہی دین کی سب سے بڑی ضرورت اور دین اسلام کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ دین ہی انسان کو اس بلند مقام پر کھڑا کرتا ہے جہاں سے وہ ایک نظر میں ساری کائنات کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے توحید کے بغیر انسانی ہمدردی، اخوت اور مساوات کے سارے دعوے غلط ثابت ہوتے ہیں۔

توحید کے معنی یہ ہیں کہ کائنات ایک اور اس کا خالق ایک ہے۔ قل ھو اللہ احد اے رسول! آپ کہہ دیجیے اور بتا دیجیے کہ اللہ تو بس ایک ہے، خدائی میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں، کوئی اس کا ہمسر نہیں، عبادت کے لائق وہی ہو سکتا ہے جو خالق ہو، مخلوق کی عبادت کرنا انسان کی پست ہمتی اور کوتاہ بینی ہے۔ لا الہ الا اللہ کوئی معبود نہیں بجز اللہ کے۔ کائنات کا ایک ہونا بدیہی بات ہے، ہر معمولی سمجھ رکھنے والا جو آنکھ کھول کر سورج، چاند، ستاروں کو دیکھتا ہے، اختلاف اللیل والنہار یعنی رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ سارے عالم میں ایک ہی نظام کارفرما ہے۔ جوں جوں انسان علوم میں ترقی کرتا ہے اور فطرت کے دقیق اور حکیمانہ نظام سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ یہ بدیہی حقیقت ایک علمی حقیقت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے کہ ہر ذرہ، ساری کی ساری کائنات سے متاثر اور اس میں موثر بھی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی فطرت میں کھو جائے اور خالق کو

نہ پہچانے لیکن سائنس کی ترقی میں کم از کم اس بات کی ضمانت تو موجود ہے کہ انسانی عقل و فکر میں ایک سے زائد خداؤں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ چونکہ کائنات کا نظام ایک ہے اس لیے خالق بھی صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ لو کان فیہما آلہۃ الا اللہ لفسدتا اگر آسمان و زمین میں اللہ کے علاوہ کوئی اور بھی خالق و معبود ہوتے تو ساری کائنات ضرور درہم برہم ہو جاتی۔ سائنس کی ترقی اس بات کی بھی ضامن ہے کہ اب انسان کو کسی مخلوق پر خالق کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ توحید کے عقیدہ کی بدولت انسان زمان و مکان کی قیود سے آزادی حاصل کرتا ہے۔ ہر انسان کرۂ ارض کے ایک نقطہ پر اپنے آپ کو پاتا ہے۔ اس کا دامانِ نظر محدود ہوتا ہے اس لیے وہ مختلف تعصبات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے تعلقات اور اس کی ہمدردیاں محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن یہ انسان کی بڑی بدبختی ہے کہ وہ وسیع کائنات سے ربط و ہم آہنگی پیدا کرنے کے بجائے ایک چھوٹی سی چار دیواری میں بند ہو کر رہ جائے۔ اس کا وبال انسان کو اسی دنیا میں بھگتنا پڑتا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان نفرت اور عداوت کی دیواریں حائل ہو جاتی ہیں اور یہ نفرت و عداوت بالآخر خونریزی اور ظلم و تعدی کا وہ بھیانک منظر دکھاتی ہے جس کی بابت تخلیق آدم کے وقت فرشتوں نے کہا تھا: اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفك الدماء اے خدا! کیا تو دنیا میں اس مخلوق کو بھیج رہا ہے جو وہاں فساد برپا کرے گی اور خون بہائے گی؟ اس شر اور فساد کا ایک اور صرف ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ انسان خالق کائنات کو پہچانے۔ جب انسان خالق کائنات کو پہچان لیتا ہے تو اس کے اندر خیر اور بھلائی کی صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ اس وقت اس کی سعی و کوشش، اس کا علم اور اس کی مادی طاقت ساری انسانیت کے لیے رحمت بن جاتی ہے۔ جب انسان وسیع کائنات سے ربط و ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے تو وہ خود اپنے اندر ایک کشادگی، اور نفسیاتی سکون و اطمینان محسوس کرتا ہے، وہ خود اپنے وجود سے راضی ہو جاتا ہے۔ اسی کو قرآن میں النفس المطمئنہ کہا گیا ہے۔ جس کا اپنا شعور مطمئن ہو اس کو دنیا کی ہر چیز ایک

نعمت معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کے بعد اس میں دنیا سے گریز اور فرار کا رجحان باقی نہیں رہتا۔ پھر انسان سکڑتا اور سمٹتا نہیں ہے بلکہ اپنے شعور میں ساری کائنات کو سمو لیتا ہے۔ عقیدۂ توحید ہی کی بدولت انسان میں عدل کا تصور پیدا ہوتا ہے اور وہ خود غرضی چھوڑ کر تمام بنی نوع کو نیک مقاصد میں برابر کا شریک بنانے کے لیے اقدام کرتا ہے۔ یہی انسانیت کا کمال اور دنیا و آخرت کی سعادت ہے۔

توحید ایک سیدھی سادی حقیقت پر مشتمل ہے جس کو فطرت سلیمہ بغیر کسی دشواری کے پہچان لیتی ہے اور مان لیتی ہے، لیکن عملی نتائج کو دیکھا جائے تو یہ ایک بڑا انقلابی عقیدہ ہے۔ تمام عالم ایک اور اس کا خالق اور رب ایک،۔ اس عقیدہ کی مدد سے نہ صرف انسان کا تعلق خدا کے ساتھ متعین ہوتا ہے، بلکہ انسان کا تعلق فطرت کے ساتھ، اور انسان کا تعلق دوسرے انسانوں کے ساتھ بھی اسی عقیدہ سے متعین ہوتا ہے۔ جو اس عقیدہ پر ایمان رکھتا ہو اس کی نظر میں فطرت کا ذرہ ذرہ خدا کی آیت اور نشانی ہے، خدا کی نعمت ہے، مادی دنیا کوئی گھناؤنی چیز نہیں جس سے نفرت کی جائے اور فرار کی راہیں ڈھونڈی جائیں۔ فطرت کی کوئی چیز برسرپیکار نہیں بلکہ ہر چیز انسان کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل میں ممد و معاون ہے۔ فطرت میں شر نہیں۔ یہ دنیا بجز اس کے نہیں کہ انسان کے علم و عمل کی ایک جولان گاہ ہے۔ یہ یقین کہ انسان ایسے ماحول میں ہے جو اس کی تباہی اور بربادی کے درپے نہیں بلکہ اس کے آرام و آسائش کے لیے بنایا گیا ہے اور اس لیے بنایا گیا ہے کہ انسان کو اپنے بلند مقاصد کی تکمیل کے ذرائع و وسائل مہیا ہو سکیں۔ یہ یقین ایک عجیب طمانیت قلب کا باعث ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ منزل آتی ہے جب انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرتا ہے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ منزل بہت ہی دشوار ہے۔ علوم کی ترقی نے اگر فطرت کو سمجھنے میں مدد دی ہے تو انسانی تعلقات میں عدل کے قیام کو دشوار سے دشوار تر بنا دیا ہے۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی علوم سے جو بے توجہی بڑھتی جا رہی ہے اس سے یہی اندیشہ ہوتا ہے، اور یہ اندیشہ روز بروز صحیح ثابت ہوتا جاتا ہے، کہ انسانی معاشرہ میں فساد پیدا

ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت میں خود غرضی، انانیت اور ذاتی تفوق اور برتری کا جو عنصر ہے اس کا تریاق عقیدۂ توحید کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر انسان محض عقل سے اس کا قائل بھی ہو جائے کہ تمام انسانوں کی اصل ایک ہے تب بھی وہ اپنی عملی زندگی میں اس جانی بوجھی حقیقت سے روگردانی کرتا ہے۔ البتہ جب اس حقیقت کو خالق کائنات سے ربط دیا جائے اور عقل کے ساتھ وجدان میں خوف خدا بھی شامل ہو جائے تب وہ نتائج مترتب ہوتے ہیں جو اسلامی معاشرہ میں دنیا دیکھ چکی اور آج اس گئی گزری حالت میں بھی دیکھ رہی ہے۔ عرب ایک ایسی قوم تھی جو اپنے قبائلی نظام کی بدولت پارہ پارہ تھی اور قبیلہ کے باہر عدل و مساوات کے تصور سے بھی ناآشنا تھی۔ اسلامی تعلیمات کا اثر تھا کہ یہ قوم وحدتِ انسانی کا پیام لے کر نکلی اور دنیا رنگ و نسل کے امتیازات کو مٹتے ہوئے دیکھ کر حیرت میں رہ گئی۔ اس بارے میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جعلنا کم شعو با وقبائل لتعارفوا ہم نے قوموں اور قبیلوں کا فرق صرف اس لیے رکھا ہے کہ تمہارے لیے آپس میں پہچاننا آسان ہو جائے۔ رسول اللہ نے اس کو وضاحت سے یوں بیان فرمایا کہ:

کلکم من آدم وآدم من تراب تم سب ایک آدم کی اولاد ہو، وہی آدم جس کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد کسی فرد کے لیے غرور اور پندار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ گو اصل کے اعتبار سے سب انسان برابر ہیں تاہم فضل کے اعتبار سے ان میں مراتب کا فرق ہے۔ چنانچہ رسول اللہ کا ارشاد ہے لا فضل لعربی علی عجمی الا بالتقوی عربی کو عجمی پر اگر فضیلت حاصل ہو سکتی ہے تو وہ صرف تقویٰ کی رو سے۔ اللہ کے یہاں بھی تقویٰ کے اعتبار سے درجات ملتے ہیں ان اکرمکم عند اللہ اتقکم اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔ تقویٰ اور فضیلت کا اعتراف اور اس کا احترام ایک صالح معاشرہ کا سنگ بنیاد ہے۔ ہر معاشرہ کے لیے تنظیم ضروری ہے اور نیکی اور فلاح کی امید اسی معاشرہ سے کی جا سکتی ہے جس کی تنظیم تقویٰ کے لحاظ سے عمل میں آئے۔ تقویٰ کے مفہوم میں علم و عمل دونوں شامل ہیں۔ علم کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ نفع بخش ہو۔ نفع بخش اس معنی میں کہ انسانیت کی

تکمیل میں مدد دے، ادب اور تہذیبِ نفس سکھائے، جس سے اخلاقی معیار بلند ہو، جس سے نہ صرف دنیا حاصل ہو بلکہ دنیا کے برتنے کے طریقے معلوم ہوں۔ عمل کی بابت ایک جامع اور مختصر حدیث ہے کہ انسان اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے، اپنے عقیدے اور خیال کے اظہار میں کسی طاقت سے نہ ڈرے اور ہر قربانی کے لیے تیار ہو، گرگٹ کی طرح رنگ نہ بدلے، زمانہ سازی نہ کرے، ضمیر فروشی نہ کرے، اپنی رائے اور تائید کو سامان تجارت نہ بنالے۔ اسلامی تاریخ کے بیشتر دَور ایسے گزرے ہیں جن میں ایسے باعمل علماء کی کمی نہ تھی اور معاشرہ میں ان کو جو مقام حاصل تھا اس پر بڑے بڑے جابر حکمراں بھی رشک کرتے تھے۔ جب سے ہمارے یہاں علم وعمل کے بجائے دولت وثروت، جاہ ومنصب اور طاقت وجبروت کا اعزاز واحترام کیا جانے لگا اسی وقت سے انحطاط کا آغاز ہوا یہاں تک کہ بعض نام نہاد علماء بھی اس وبا کا شکار ہو لے لگے۔ موجودہ دور میں ایسے بہت سے مواقع آتے ہیں جب عوام سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ عزت وتکریم کا مستحق کس کو سمجھتے ہیں۔ ایسے مواقع پر اگر عوام علم وعمل کے معیار سے انحراف کر جائیں تو کبھی بھی کسی اصلاح کا کارگر ہونا ممکن نہیں۔ اچھے سے اچھے نظام کی کامیابی اور برقراری کی ضمانت صرف عوام کا شعور اور عوام کی اخلاقی جرأت ہے۔ اس بات کو تو سب مانتے ہیں البتہ ایک بات اور ہے جس کا صاف طور پر اعتراف کرنے میں پہلوتہی کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ عوام میں اخلاقی جرأت اور تقویٰ کی پاسداری صرف دینی جذبہ کے ذریعہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس لیے قوم کے ہر مخلص اور بہی خواہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ دین کے احیاء کے لیے کوشاں ہو اور دین کے مطالبوں سے کسی طرح تنگی نہ محسوس کرے۔ جس روز ہمارے درمیان بلا قید وشرط دین کے سچے احترام کی مثال قائم ہو گئی اس روز سمجھنا چاہیے کہ اصلاح وتعمیر کی مہم سر ہو گئی۔